۳۰

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کا مصداق بننا چاہیئے

(فرمودہ ۱۷- نومبر ۱۹۳۳ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ایک طرف تو اپنے گردوپیش کے اثرات کو قبول کرنے کیلئے بڑی شدت سے مائل رہتا ہے- اور دوسری طرف اس میں یہ بھی طاقت ہے کہ اگر چاہے تو ایسے اثرات کو قبول کرنے سے انکار کردے- گویا ایک طرف تو وہ ایک چٹان ہے ایسی مضبوط چٹان کہ جس سے سمندر کی تیز لہریں ٹکراکر ہمیشہ واپس لوٹ جاتی ہیں اور اس پر ذرہ بھی نشان پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتیں- اور دوسری طرف وہ ایک سپنج کے ٹکڑے کی طرح یا نرم موم کی طرح ہے کہ اس پر ہاتھ ڈالتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں طاقتِ مقابلہ ہے ہی نہیں- اور یہ دونوں چیزیں انسان کے تمام اعمال کی جڑ ہیں- یعنی کسی جگہ پر اثر کو قبول کرنا اور کسی جگہ پر ردّ کردینا- نہ تو ہر جگہ اثر قبول کرنا مفید ہوسکتا ہے اور نہ ہر جگہ رد کردینا-

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ مومنوں کی یہ صفت بیان فرماتا ہے کہ وہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ[1] - ہوتے ہیں- یعنی یہ نہیں کہ وہ ہر اثر کو قبول کرنے والے ہوتے ہیں- کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ شیطان کا اثر بھی قبول کرلیتے ہیں اور یہ بھی نہیں کہ کسی کا اثر قبول کرتے ہی نہیں- کیونکہ اس صورت میں وہ فرشتوں کے اثر کو بھی ردّ کردیتے ہیں- بلکہ مومن کے اندر دونوں باتوں کا پایا جانا ضروری ہے- ان میں سے ایک کو اپنے اندر پیدا کرکے انسان

نیک نہیں بن سکتا- اور نہ ہی ایک سے تقویٰ قائم رہ سکتا ہے- ضروری ہے کہ کامل انسان میں یہ دونوں باتیں پائی جائیں- اس میں یہ بھی طاقت ہو کہ خواہ کتنی ہی تکلیف دہ بات ہو پھر بھی غلط اثر کو قبول نہ کرے اور یہ بھی چاہیئے کہ خواہ حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہو- پھر بھی اچھی چیز کے اثر کو رد نہ کرے- اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ - جب کسی ایسی چیز کا سوال ہو جو مذہب ودین کے خلاف ہو تو چاہیئے کہ کہ مومن ایک ایسی چٹان کی مانند ہو جس پر کوئی چیز اثر ہی نہیں کر سکتی- لیکن جہاں تقویٰ کا معاملہ ہو' وہاں ایسا معلوم ہو کہ وہ قبل از وقت ہی جُھک رہا تھا- نیکی کا سوال تو بعد میں پیدا ہوا- اس کے قبول کرنے کا میلان اس کے اندر پہلے ہی موجود تھا- اس درجہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اُس دیئے سے تشبیہ دی ہے جو قریب ہے کہ آگ کے بغیر ہی جل پڑے- یہی مقام ہے کہ جب انسان اسے ہر قسم کی ملونی سے پاک کر دیتا ہے- تو اسی کو صدّیقیّت کہتے ہیں- صِدّیق اور مُصَدِّق میں یہی فرق ہوتا ہے- مُصَدِّق تو بعد میں آکر کہتا ہے کہ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں- مگر صدیق میں اس کے قبول کرنے کا میلان پہلے ہی موجود ہوتا ہے- یوں تو سب صحابہ مصدق تھے- لیکن صدّیقیّت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے بڑھے ہوئے تھے- ہمارے زمانہ میں بھی صوفی احمد جان صاحب جو پیر منظور احمد صاحب اور پیر افتخار احمد صاحب کے والد اور حضرت خلیفہ اول کے خسر تھے' صدّیقیّت کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے- ابھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعویٰ بھی نہ کیا تھا کہ انہوں نے آپ کو ایک خط لکھا جس میں یہ شعر تھا-

ہم مریضوں کی ہے تمہیں پہ نظر
تم مسیحا بنو خدا کیلئے

ابھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی نہیں سمجھتے تھے کہ میں مسیح موعود ہوں- مگر انہوں نے کہا کہ آپ ایسا دعویٰ کریں ہم آپ کو ماننے کیلئے تیار بیٹھے ہیں- یہی صدّیقیّت کا مقام ہے-

جب رسول کریم ﷺ نے دعویٰ کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی قریب یا بعید کے مقام پر باہر گئے ہوئے تھے- آپ کا دعویٰ سن کر لوگ اِدھر اُدھر دوڑ پڑے کہ خبر دیں کہ ایسے اچھے آدمی کو کیا ہوگیا ہے- وہ آپ کو پاگل سمجھنے لگ گئے تھے- جھوٹ تو بعد میں اس

وقت کہا جب ضدّ ہوگئی ورنہ شروع شروع میں وہ پاگل ہی سمجھتے تھے۔ آپ کے دعویٰ کو سنتے ہی عام چرچا شروع ہوگیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت روایت ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کے گھر میں بیٹھے تھے کہ ایک لونڈی آئی اور اس نے کہا کچھ سنا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا ہوا؟ اس نے کہا تمہارے دوست محمد(ﷺ) کی عقل ماری گئی ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ بات کیا ہے۔ اس نے کہا وہ کہتا ہے خدا میرے ساتھ باتیں کرتا ہے' میرے پاس فرشتے آتے ہیں' میں نبی ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ نے سن کر کہا اگر وہ ایسا کہتا ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ اس کے بعد آپ وہاں ٹھہرے نہیں بلکہ فوراً آئے اور رسول کریم ﷺ کے مکان پر پہنچے۔ رسول کریم ﷺ اُس وقت اندر تھے حضرت ابوبکرؓ نے جب دستک دی تو آپ باہر تشریف لائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے کوئی دعویٰ کیا ہے۔ آپؐ اس خیال سے کہ ابوبکرؓ پرانا دوست ہے ایسا نہ ہو کہ ٹھوکر کھاجائے' کوئی دلیل دینے لگے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے کہا مجھے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ نے کوئی دعویٰ کیا ہے یا نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اگر دلیل سننے کے بعد ایمان لاتے تو مصدق ہوتے' صدیق کا مقام نہ حاصل کرسکتے۔ صدّیقیّت کیلئے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ انسان کے اندر سے آتی ہے۔ اور جب رسول کریم ﷺ نے بتایا کہ ہاں میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو آپ نے فوراً کہا میں اس کا مُصَدِّق ہوں[۲] - حضرت خلیفہ اول کا بھی اسی قسم کا واقعہ ہے جو آپ خود سنایا کرتے تھے۔ فرماتے میں جموں میں تھا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس وقت توضیح مرام اور فتح اسلام رسائل چھپوارہے تھے۔ ان کا کوئی پروف کسی غیراحمدی نے چرایا اور جموں لے آیا۔ وہاں اپنے دوستوں سے کہا کہ میں نے اب نوردین کو قابو کرنے کا سامان کرلیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کس طرح قابو کرلیا ہے۔ اس نے کہا کہ خواہ کچھ بھی ہو میں یہ جانتاہوں کہ اس کے دل میں رسول کریم ﷺ کا عشق ضرور ہے۔ اور اب میں نے ایک ایسی بات مرزا صاحب کی پکڑی ہے کہ جس شخص کے دل میں رسول کریم ﷺ کا عشق ہو وہ انہیں کبھی نہیں مان سکتا۔ آخر کچھ لوگ ایک دن اکٹھے ہو کر آئے۔ اور اس شخص نے خلیفہ اول سے دریافت کیا کہ رسول کریم ﷺ خاتم النبیّنؐ ہیں یا نہیں؟ آپ نے کہا ہیں۔ اُس نے پوچھا آپ کے بعد کوئی رسول آسکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے کہا نہیں۔ اس نے کہا اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے؟ آپ نے فرمایا کہ میں سمجھوں گا اس نے

غلطی کی- اس پر اس نے وہ پروف نکال کر سامنے رکھ دیا اور کہا دیکھو! مرزا صاحب ایسا دعویٰ کرتے ہیں- خلیفہ اول نے کہا کہ اگر میرزا صاحب کا یہ دعویٰ ہے تو میں سمجھوں گا میرے معنے غلط ہیں کیونکہ جب آپ کو مأمور مان لیا تو پھر میں ہی غلطی پر ہو سکتا ہوں وہ نہیں ہو سکتے- یہ سن کر اس کا رنگ زرد ہوگیا- اور اس نے کہا چلو اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی- تو صدّیقیّت یہی ہے کہ نفس عکس قبول کرنے کیلئے پہلے سے تیار ہو- اسے دبانا نہ پڑے بلکہ اس کے متعلق تو یہ خدشہ ہوتا ہے کہ گرفت زیادہ پڑ کر ضرر نہ پہنچ جائے- جیسے ہم جب کسی نرم چیز کو پکڑتے ہیں تو آہستگی سے پکڑتے ہیں لیکن سخت چیز کو پکڑتے وقت زور سے ہاتھ ڈالتے ہیں- اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی کیفیت جس شخص کے اندر ہو وہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی غیر آکر اس پر اثر ڈالے- وہ اپنے سے ادنیٰ اپنے بھائی کا احسان اُٹھالے گا لیکن اپنے سے اعلیٰ کسی غیر کا احسان اُٹھانا گوارا نہ کرے گا-

اس کیفیت کی مثال بھی حضرت ابوبکرؓ میں ملتی ہے- جب مکہ میں مسلمانوں کے خلاف مخالفت کا طوفان اُٹھا- اور قریش نے کہا کہ ان کو ایسا تنگ کرو کہ توبہ پر مجبور ہوجائیں- توبہ تو انہوں نے کیا کرانی تھی ہاں سختی انتہاء کو پہنچ گئی- قرآن کریم یا نماز تک پڑھنا مشکل تھا- اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو کہیں باہر چلا جاؤں جہاں عبادتِ الٰہی بِلا روک ٹوک ہوسکے- آپ نے اس وقت اجازت دے دی- اگرچہ بعد میں جب آپ کو علم ہوا کہ آپ کو بھی ہجرت کرنی پڑے گی تو آپ ان کو روکتے رہے- حضرت ابوبکرؓ مکہ سے جانے کی تیاریاں کررہے تھے کہ ایک سردارِ مکہ؎ ان کے پاس آیا اور پوچھا کہاں جاتے ہو؟ آپ نے کہا میں مکہ کو چھوڑ رہا ہوں یہاں نمازوں وغیرہ کی آزادی نہیں- اس نے کہا ہم آپ کی منت کرتے ہیں کہ آپ نہ جائیں- آپ جیسے آدمیوں سے تو مکہ میں برکت ہے میں لوگوں کو سمجھاؤں گا- پھر اس نے لوگوں سے کہا- لوگوں نے مان لیا اور حضرت ابوبکرؓ کو آزادی ہوگئی؎ - لیکن ایک دن آپ نے جب دیکھا کہ بعض غلام مسلمانوں کو تکالیف دی جارہی ہیں تو آپ نے کہہ دیا کہ میں کسی کی پناہ نہیں چاہتا- مجھے یہ پسند نہیں کہ باقی مسلمانوں کو دکھ ہو اور میں امن میں رہوں- اس طرح آپ نے دوسروں کا احسان اُٹھانے سے انکار کردیا- میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک روایت سنی ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ کی مجلس میں آپ کے فرزند عبدالرحمٰن نے جو

پہلے مخالف تھے مگر بعد میں انہوں نے بہت ترقی کی کہا کہ ایک دفعہ مجھے دشمنوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جنگ کیلئے جانا پڑا ایک موقع پر آپ ایسی جگہ تھے کہ میں آپ پر وار کرسکتا تھا مگر باپ سمجھ کر میں نے ایسا نہ کیا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا خدا کی قسم! اگر میں ایسا موقع پاتا تو ضرور وار کردیتا۔[۵] - تو اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کے یہی معنے ہیں کہ مومن جہاں ایک طرف حق کے عکس اور اثر کے مقابلہ میں ایسا نرم ہوتا ہے کہ ان کا معمولی دباؤ بھی برداشت نہیں کرسکتا اور ایسا ہوتا ہے جیسے تصویر لینے کا شیشہ۔ وہاں دشمن کے مقابل میں اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ بیٹے کی جان کی بھی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس قسم کے اور بھی لوگ صحابہ میں موجود تھے۔ حضرت عثمان بن مظعون کے متعلق ایک اسی قسم کا واقعہ آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شاعر[۶] جو کہیں باہر سے آیا ہوا تھا' اپنا کلام سنا رہا تھا۔ اس نے ایک شعر کا ابھی پہلا ہی مصرعہ پڑھا تھا کہ آپ نے کہا خوب ہے۔ اس پر وہ بہت جز بز ہوا۔ اور اس نے کہا مجھے تیرے جیسے انسان کی داد کی کیا ضرورت ہے۔ پھر اس نے اہلِ مکہ کو مخاطب کرکے کہا کہ کیا اب تمہارے ہاں شرفاء کی یہی قدر ہوتی ہے۔ اس کے بعد اُس نے دوسرا مصرعہ پڑھا تو آپ نے فرمایا یہ ٹھیک نہیں۔ اس پر مکہ کے رؤسا میں سے ایک نے اٹھ کر آپ کو ایسا مُکّا مارا کہ آپ کی ایک آنکھ نکل گئی۔ آپ اس واقعہ سے کچھ عرصہ قبل تک ایک شخص کی پناہ میں تھے۔ مگر خود ہی دوسرے مسلمانوں کی تکالیف کو دیکھ کر اس کی پناہ ترک کردی تھی۔ وہ شخص آپ کا عزیز بھی تھا' یہ حالت دیکھ کر اسے رنج ہوا۔ اور اس نے کہا میری پناہ میں نہ رہنے کا نتیجہ تم نے دیکھ لیا۔ آپ نے جواب دیا میں اس قسم کا احسان اُٹھانے کو اب بھی تیار نہیں ہوں میری تو دوسری آنکھ بھی اسی کی منتظر ہے[۷] - تو صحابہ میں اور بھی کئی صدیق تھے۔ حضرت ابوبکرؓ تو ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ حضرت عثمان بن مظعون بعد میں شہید ہوئے۔ حضرت رسول کریم ﷺ کو آپ سے اتنی محبت تھی کہ وفات کے قریب تک محبت سے ان کا ذکر کرتے رہے۔ حتّٰی کہ جب آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کی وفات کا وقت آیا۔ تو آپ نے انہیں اپنی گود میں لیا۔ اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور آپ نے کہا۔ جا! اپنے بھائی عثمان کے پاس[۸] -

مَیں بتارہا تھا کہ مومن کے اندر ایک طرف تو اتنی شدت ہوتی ہے کہ دوسرے کا اثر اس پر ہو ہی نہیں سکتا اور دوسری طرف ایسی نرمی ہوتی ہے کہ گویا اثر پہلے ہی پڑا ہوا ہوتا

ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لوگ عام طور پر کمزور طبیعت کا انسان سمجھتے ہیں۔ مگر موقع پر معلوم ہوتا ہے کہ دین ومذہب کے بارہ میں آپ کے اندر کس قدر سختی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں بھی آپ کو کمزور طبیعت کا ہی سمجھتا تھا۔ رسول کریم ﷺ کی وفات پر جب سارے عرب میں بغاوت پھیل گئی اور لوگوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کردیا تو میں نے آپ سے کہا کہ بہتر ہے کہ کچھ دنوں کیلئے زکوٰۃ لینی چھوڑ دی جائے۔ جب لوگ ٹھنڈے ہوجائیں گے تو پھر ان کو سمجھا کر اس پر آمادہ کرلیا جائے گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے خاص طور پر میری طرف دیکھا۔ آپ کے والد کا نام ابو قحافہ تھا۔ اور وہ اگرچہ خاندانی آدمی تھے لیکن مالی لحاظ سے ان کی حالت غربت کی تھی۔ اس لئے خاندانی ہونے کے باوجود انہیں کوئی خاص عزت حاصل نہ تھی۔ اور حضرت ابوبکرؓ جب اپنی تحقیر کرنا چاہتے تو اپنے آپ کو ابنِ ابی قحافہ کہتے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے توجہ سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ کیا ابنِ ابی قحافہ کی طاقت اتنی ہے کہ جس چیز کو رسول کریم ﷺ نے جاری کیا اسے بند کردے۔ خدا کی قسم! جو شخص رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں اونٹ کی ایک رسّی بھی دیتا تھا وہ اب اگر انکار کرے گا تو میں اس کیلئے بھی اس کے ساتھ جنگ کروں گا۔ عمر! یہ مت خیال کرو کہ ہم تھوڑے ہیں۔ اگر دشمن مدینہ کے اندر بھی آجائیں اور کتے ہماری عورتوں کی لاشوں کو گھسیٹتے پھریں تو بھی میں زکوٰۃ نہ چھوڑوں گا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اُس وقت میں نے خیال کیا۔ واقعی شیخ بڑا بہادر ہے[۹]۔ حضرت عمرؓ محبت کی وجہ سے آپ کو شیخ یعنی بوڑھا کہہ دیا کرتے تھے۔ اور بعد کے واقعات نے بتادیا کہ اُس وقت کی ذرا سی کمزوری کس قدر نقصانات کا موجب ہوسکتی تھی۔ غور کرو جو شخص مومن کی ذرہ بھر کی تکلیف بھی برداشت نہیں کرسکتا وہ دوسری طرف دین و مذہب کے معاملہ میں اپنے اندر کس قدر سختی رکھتا ہے کہ تمام ملک کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتا۔ بڑے بڑے بہادر گھبرا اُٹھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ صلح کرلی جائے مگر وہ اس کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ تو جو بات کامیاب کرتی ہے وہ یہی ہے کہ آپس میں محبت ہو۔ مگر جہاں مخالف یا منافق مقابلہ پر آجائے' مومن اس کی بات نہ سن سکے۔ بہت لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ کسی کافر یا منافق کی حمایت کریں گے اور احمدی کی مخالفت۔ جب کسی نے ان سے کہا کہ فلاں احمدی نے مجھے یہ نقصان پہنچایا تو وہ فوراً مان جائیں گے۔ اور اس کی حمایت کرتے ہوئے احمدی کی مخالفت شروع کردیں گے۔ وہ جھٹ

کہنے لگ جائیں گے کہ واقعی اس پر بڑا ظلم ہوا- حالانکہ مومن کو چاہیئے کہ اپنے بھائی کے متعلق حسن ظنی سے کام لے- میں یہ نہیں کہتا کہ بات سنانے والے پر ضرور بدظنی کرو- لیکن وہ جو بدظنی پیدا کرتا ہے اس کی بات کو بھی بغیر تحقیقات کے نہ مان لو- حسن ظنی نیکی اور احسان پہلے گھر سے شروع ہونا چاہیئے- بدظنی سے اسلام نے روکا ہے- لیکن جب دو میں سے کسی ایک پر کرنی پڑے تو جسے اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطا فرمائی ہے' اس میں کوئی نہ کوئی خوبی زیادہ ماننی پڑے گی- یہ بھی ممکن ہے کہ وہی غلطی پر ہو لیکن پہلے تو اس پر حسن ظنی ہونی چاہیئے- ہاں جب معلوم ہوجائے کہ وہ واقعی زیادتی کررہا ہے تو پھر اس کو روکنا چاہیئے- رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنے بھائی کی خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم مدد کرو[۵] - اور صحابہ کے دریافت کرنے پر بتایا کہ ظالم کو ظلم سے روکنا اس کی مدد کرنا ہے- لیکن جب تحقیق سے اپنے بھائی کا غلطی پر ہونا معلوم نہ ہوجائے' اس وقت تک خیال کی بنیاد لازماً حسن ظنی پر ہونی چاہیئے- اور اگر دوست اس اصل پر عمل شروع کردیں تو بہت سے فتنے مٹ جائیں- میں نے دیکھا ہے کہ یہاں ایک شخص عبداللہ چرخی تھا- اس کے پاس اگر کوئی بیٹھتا تو ہمارے بعض دوست گھبراتے کہ کہیں کوئی اثر قبول نہ کرلے- حالانکہ اگر کسی پر ایسی باتوں کا اثر ہوتا ہے تو یہ ہماری کمزوری اور ہماری تربیت کا نقص ہے کہ اس کے اندر صدّیقیّت کا مادہ نہیں پیدا کرسکے- انسان کے اندر جب ایمان کی طاقت ہو تو وہ کسی مخالف کے اثر کو قبول کرسکتا ہی نہیں- کئی اعتراضات ایسے ہوتے ہیں جو ہم نے کبھی سنے نہیں- مگر جب وہ ہم پر کئے جاتے ہیں تو جواب اللہ تعالیٰ فوراً سمجھا دیتا ہے- کبھی کسی بڑے سے بڑے لائق اور فاضل انسان کی طرف سے اسلام پر کوئی ایسا اعتراض نہیں کیا گیا جسے سن کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہوں کہ اچھا اس پر غور کریں گے' فوراً اس کا جواب سوجھ جاتا ہے- تو ایمان کی کھڑکیاں جب کھلی ہوئی ہوں تو کوئی مخالف طاقت اپنا اثر کر نہیں سکتی- مومن کا فرض ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بزرگی دی اور ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی ان کی بات کی طرف زیادہ توجہ دے- اور اگر ایسا کیا جائے تو سب فتنے مٹ جائیں- فتنے دراصل پیدا ہی اس طرح ہوتے ہیں کہ منافقوں کی باتوں پر ایمان لایا جاتا ہے- ہم یہ تو مان سکتے ہیں کہ کسی کو کوئی ایسا معاملہ پیش آیا جو سچا تھا- اور اس سے اسے ابتلاء آگیا- لیکن یہ کہ جو شخص صبح کو بدظن ہوا' شام کو اس کا مقصد اصلاح ہوگیا یہ خیال کرنا بیوقوفی ہوگی- ہر کفر کی ہوا سے دب جانا اور ایمان کی ہوا سے کھڑا ہوجانا کوئی

خوبی نہیں ہوسکتی- اور ایسے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سؤر بیچنے کیلئے گھر سے چلا- راستہ میں ایک کھمبے کے ساتھ اسے باندھ کر خود قضائے حاجت کیلئے گیا- اس کھمبے کی تختی کمزور تھی- سؤر نے جو زور لگایا تو وہ دوسری طرف ہوگئی اور اس کا رُخ بدل گیا- وہ جب آیا تو بغیر اس کے کہ وہ غور کرتا کہ میں کدھر سے آیا تھا اور کدھر کو جانا ہے- اس نے سؤر کو کھولا اور جس طرف تختی کا رُخ تھا اسی طرف لے کر چل پڑا- آخر جب گھر پہنچا تو کہنے لگا- میں نے ساری دنیا کا سفر کرلیا ہے اور زمین گول ہونے کی وجہ سے پھر گھر آگیا ہوں-

تو ایسے لوگ محض تختی کے اُلٹ جانے سے اُلٹے چل پڑتے ہیں اور آنکھ کھول کر نہیں دیکھتے- اس قسم کی فطرت ہمیشہ نقصان کا موجب ہوتی ہے- جس شخص کے دل کی کھڑکیاں کفر کی طرف سے بند ہوں، اس کے اندر کفر کی بات داخل ہی کیسے ہوسکتی ہے- اور ایمان اس کے اندر داخل ہونے سے کس طرح رہ سکتا ہے- کمرہ سے باہر دری جھاڑی جائے تو کمرہ کے اندر کی ہر چیز پر گرد نظر آتی ہے- پھر سوچنا چاہیئے کیا ایمان ہی ایسی کمزور چیز ہے کہ کھڑکیاں کھلی ہوں اور وہ اندر نہ آسکے- حالانکہ ایمان نہایت لطیف چیز ہے- اور ہر لطیف چیز زیادہ پھیلتی ہے- اگر کسی نے ایمان کی طرف کی کھڑکی کھولنی ہو تو اس کا یہی طریق ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ پر عمل کرے- ایسا انسان خطرہ سے باہر ہوجاتا ہے- اسے اگر دشمنوں میں بھی پھینک دو تو وہ ان میں سے بھی بعض کو اپنے ساتھ لے آئے گا- اس پر کوئی اثر نہ ہوگا اور اگر مومنوں میں ہو تو اور بھی بڑھتا اور ترقی کرتا جائے گا- پس جو لوگ اپنے ایمان کی اصلاح چاہتے ہیں انہیں چاہیئے کہ اس آیت پر غور کریں- اور اپنے رشتہ داروں، بھائیوں، دوستوں، افسروں، ماتحتوں غرضیکہ کسی موقع پر جب مذہب اور تصدیق کلمات ونشاناتِ الٰہیہ کا معاملہ ہو تو کسی کی پرواہ نہ کریں- اور اپنے آپ کو ان کی باتوں سے بالکل متأثر نہ ہونے دیں- ہاں جب کوئی دینی معاملہ ہو تو ان کے دلوں کی کھڑکیاں بالکل کھلی ہوں تا اللہ تعالیٰ کا نور ان کے اندر داخل ہوسکے-

(الفضل ۲۳ - نومبر ۱۹۳۳ء)

---

[۱] الفتح: ۳۰

[۲] السیرة الحلبیة جلد ۱ صفحہ ۳۰۹ المطبعة الازھریة مصر ۱۹۳۵ء

[۳] ابن دغنہ

۴؎ بخاری کتاب مناقب الانصار باب ھجرۃ النبیؐ و اصحابہ الی المدینۃ

۵؎

۶؎ حضرت لبید بن ربیعہ

۷؎ سیرت ابن ھشام جلد ۱ صفحہ ۱۲۸ مطبوعہ مصر ۱۲۹۵ھ

۸؎ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد ۳ صفحہ ۱۶۵ دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۵ء

۹؎ تاریخ الخلفاء للسیوطی صفحہ ۷۰ مطبوعہ لاھور ۱۸۷۰ء

۱۰؎ بخاری کتاب المظالم باب اعن اخاک ظالمًا او مظلومًا